اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کی تخلیقات میں سماجی گھٹن کے تاریخی و ثقافتی عوامل

مہرونہ لغاری/ ڈاکٹر انوار احمد/ ڈاکٹر روبینہ ترین

Abstract:

"In this article PhD research scholar has traced social and cultural factors which has created social suppression and hallowness despite the claim of a society based upon high moral ground.Urdu Novelists have portrayed the complexity of the situation in an individual level and as a society too.From Nazeer Ahmad to Hassan Manzar Urdu novel has seen the bold pen and brush upon its convas being broaden by changing landscape.Treatment approach and outlook of the scholar is based upon historicity and post colonial vision.

It is result of group research conducted under the PhD supervisors Dr.Anwaar Ahmad and Dr.Rubina Tareen leading to PhD degree in Urdu."

ادب کا کوئی بھی مطالعہ تاریخی و ثقافتی دائرے سے باہر بے معنی ہو جاتا ہے۔ادب زندگی کا آئینہ ہے اس آئینے میں جو تصاویر کاغذ کے پنوں پر یا انسانی اذہان پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔اس میں تاریخی تناظرات اور تہذیبی و ثقافتی رویے ہی ادب کے لیے بصیرت افروز معنی پیدا کرتے نظر آتے ہیں ادب کی تجسیم میں تاریخ و سماجی تہذیب کی نبض چلتی نظر آتی ہے یہ رشتہ کہیں سیدھا سادا، براہ راست جان پڑتا ہے اور کہیں اس کے پیچھے ایسا پیچدار، گہرا یا تہہ دار انسانی تجربہ، اجتماعی لاشعور کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔کہ ادب کا ایسا مطالعہ کسی باشعور اور حساس انسان کی گرفت میں ہی آسکتا ہے۔ادبی متن نئی تنقیدی تھیوری میں ایک نامیاتی کل قرار پاتا ہے۔بجا' لیکن یہ بھی حق ہے کہ ادب اپنے تاریخی و سماجی تناظر کے باہر انسانی بصیرت اور سماجی ارتقا کے لیے کسی معنویت کے اظہار سے محروم ہو جاتا ہے۔ادب تاریخ اور سماج کا زائیدہ ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ یہ معاشرے میں ،اپنے قارئین کو ایک ایسا شعور اور داخلی بصیرت فراہم کرے جو سماج کی سمت اور رفتار کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے اور جس کے ذریعے سماج کے ارتقائی عمل خواہ ترقی، خواہ تنزل ہر دو سمت کو سمجھا جا سکے۔تاکہ تاریخ کی روشنی میں ماضی کے سماجی و تہذیبی رویوں کو سمجھا سکے

۔ماضی کی روشنی میں حال کو اور حال کی روشنی میں مستقبل کا فہم حاصل ہو سکے۔ تمام ادبی اصناف میں ناول کی صنف اسی تاریخی و ثقافتی شعور کی آئینہ دار ہے کہ جہاں حیات اور بشر سے جڑے تمام رشتہ ہائے کار کا اجمالی مطالعہ کیا جا سکتا ہے ناول ہی زندگی کی روشن کتاب ہے۔ڈی ایچ لارنس نے اپنے ایک مقالے ''اخلاق اور ناول'' کا پہلا جملہ یہی لکھا کہ ''فن کا فریضہ یہ ہے کہ انسان اور اس کے گرد و پیش پائی جانے والی کائنات کے مابین جو ربط موجود ہے، اس کا ایک زندہ لمحے میں انکشاف کرے۔ چونکہ نوعِ انسانی قدیم روابط کے رنج و محن میں ہر لحظہ جد و جہد کرتی رہتی ہے اس لیے فن ہمیشہ وقت کے ادوار سے آگے ہوتا ہے''[1] اکیسویں صدی میں بر صغیر بالخصوص پاکستان میں جو ماحول یہاں کے باسیوں کو میسر آیا۔ وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر جامد، خشک، بے کیف اور تخلیق اور فن سے وابستہ جمالیاتی ذوق سے کورا ہے۔ بحیثیت حیوان جن جبلی خوشیوں اور جذبات پر انسان کا فطری حق ہونا چاہیے اسے بھی نظر بند کر دیا گیا ہے۔اجتماعی طور پر یہ معاشرہ حسن اور لذت کی خوشیوں سے محروم ہے۔ یہ ٹھس اور جامد، معاشرہ بربادی اور فنا کی علامتوں سے خود کو سجائے جس خود ساختہ اخلاقیات اور پارسائی کے خبط کو سینے سے لگائے فخر محسوس کرتا ہے۔ سماج میں طاری جبر، مردنی اور گھٹن کو اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبولنے کو تیار لیکن آگے بڑھنے کے ہنر سے نابلد ہے۔ یہ گویا ایک طرح کی ثقافتی پسماندگی ہے جس میں انسان کیا سے کیا ہو چکا ہے وہ بے خبر ہے۔ دیکھنا یہ کہ اس وقت انسان جس نازک دور سے گزر رہا ہے۔ آیا ہمارا ادب، بالخصوص ناول کے آئینے میں اقدار کے اس بحران کی دانشورانہ اور تہذیبی و تاریخی سطح پر بصیرت افروز مطالعات پیش کیے گئے ہیں۔؟ کیا ناول نگاروں نے سماج کی سمت کی نشاندہی کرنے کی سعی کی ہے۔؟ چونکہ یہ مطالعہ سماج میں موجود گھٹن کے تاریخی و ثقافتی مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اردو کے چند نمایاں ناول نگاروں نے سماجی گھٹن کے جن تاریخی و ثقافتی عوامل کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اردو دنیا کے نمائندہ ناول نگاروں نے اس ثقافتی گھٹن اور سماجی جبر کو جن عوامل کے تحت شناخت کیا ان میں مذہبی اور غیر سائنسی رویے، پدر سری نظام، مرد کی بالادستی اور عورت پر حکمرانی، عورتوں پر جبر کی متعدد شکلیں، جن میں بیٹے کو بیٹی پر فوقیت دینا، عورت کو انتخاب اور پسند کا اختیار نہ دینا، جنس جذبے کے اظہار سے محروم رکھنا، سامراجی نظام، ماضی پرستی، فنا کا احساس، فنون لطیفہ پر پابندی، تہواروں کا نہ ہونا، طاقت کی حکمرانی، طبقاتی استحصال، رنگ، نسل، زبان کی بناء پر تعصب اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، اپنی تاریخ سے غفلت کی حد تک بڑھی ہوئی لاتعلقی جیسے عوامل شامل ہیں۔

جدید اردو ناول آج سے ایک سو انچاس سال قبل ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے معروف ترین ناول "مراۃ العروس" سے عصرِ حاضر کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے جو جست لگائی تھی اس میں پہلی بار مسلم اشرافیہ کی تمدنی، سماجی زندگی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ لیکن عورتوں کی کردار سازی کے جس پراجیکٹ کو لیکر ڈپٹی نذیر احمد آگے بڑھے وہ جلد ہی اس عہد کے سماجی مذہبی جبر کا نقیب بن جاتا ہے جب وہ'' توبتہ النصوح'' لکھتے ہیں اور کلیم کے کردار کو عبرت کی تمثیل بنا کر اس کی لائبریری کو جلاتے دکھاتے ہیں۔ اور یہاں سے اردو ناول نے جس تاریخی و تہذیبی شعور کا سفر اختیار کیا وہ سرشار، شرر، مرزا ہادی رسوا سے ہوتا ہوا پریم چند کے گئودان اور میدان عمل تک جہاں پہنچتا ہے۔ پریم چند نے غلامی میں پسے ہوئے مظلوم ہندوستانیوں کو پیش کیا ہے۔ یہ گویا کہ غلامی کے رذیل ترین درجے پر فائز ہوئے کردار تھے کہ جہاں ایک طرف نوآبادیاتی نظام مسلط ہے۔ پھر اس نظام کے سہولت کار ان کے ہی ہم وطن ہیں اور پھر اس پر مستزاد وہ تیسرا طبقہ جو بنیوں کے نام سے جبر کی علامت بنا ہندوستانی کسان پر مسلط ہے۔

عزیز احمد نے پہلی بار ہوس میں مسلم معاشرے کی اخلاقیات سے جڑی تہذیبی اقدار کو موضوع بنایا جہاں شادی، بیاہ، مرد و زن کا ملاپ جیسے ممنوعہ موضوع کو چھیڑا۔ جبکہ مرمر اور خون میں جنسی گھٹن کی قباحتوں سے صرف نظر کیا۔ ایسا معاشرہ جہاں جنس شجرِ ممنوعہ ہے وہاں طبقاتی سطح پر مرد کی جنسی ہوس کا نشانہ بننے والی عذرا اور زینب کا طرزِ عمل بھی ان کے طبقاتی جبر اور گھٹن کی شدت کا عکاس بھی ہے۔

عزیز احمد کے بعد اگر سماجی جبر کے تاریخی و ثقافتی عوامل کی طرف کسی نے دھیان دیا تو اس میں قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ اور حسن منظر کو بطورِ خاص شامل کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے ایک مخصوص سماجی و معاشرتی صورتِ حال میں سماج کے اندر موجود حبس، جبر اور گھٹن کی فضا، اس کے عوامل کی نشاندہی کی۔ اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کا ناولوں میں بطورِ خاص' آخرِ شب کے ہمسفر'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ناول کا موضوع اس خطہ کی تاریخی تہذیبی فضا میں جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے خود کہا ایک کرداری بحران[۲](Disillusioned) کی کیفیت ہے جس نے تقسیم اور طبقاتی سیاست کے بطن سے جنم لیا ہے۔ ایک قوم کیونکر دو حصوں میں بٹی۔ یہ ناول اس خطہ کے مزاج و نفسیات کو اس کے تاریخی، اقتصادی اور تہذیبی سیاق و سباق میں پیش کرتا ہے۔ ناول میں قرۃ العین حیدر نے تاریخی تناظر میں تین نسلوں کو در پیش سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی گھٹن کا سامنا کرتے دکھایا ہے ملک کی تقسیم کے بعد تہذیب فنا پذیر ہوتی ہے۔ کردار اپنی جڑوں سے کٹ کر ڈھاکہ اور کلکتہ سے لندن، ماسکو، نیویارک، ٹری نیڈاڈ جا پہنچتے ہیں اور جہاں کے ہیں وہاں کی سرزمین ان کے لیے اجنبی

ہو جاتی ہے اور یوں یہ تمام کردار ماضی سے حال، جوانی سے بڑھاپے اور زندگی سے موت تک کا سفر کرتے ہیں۔ ہر نسل کے سامنے سوال اور ہیں، مسائل اور ہیں "وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو چکیں جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لیے وہ لڑائیاں لڑی گئیں۔ وہ فراموش کر دیے گئے۔ پرانے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کی مہلت دنیا کو نہیں۔ "(۳)

> "ریحان نے کہا تھا۔ دیپالی۔ ہندوستان کے نوّے فیصد انسان مفلس ہیں اور اہلِ ثروت مفلسی کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عزّتی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد، کلچر، اور اخلاق اور مذہب اور فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے، انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کردار سے عاری بنا دیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اسی لیے جھوٹے اور کمینے اور کردار سے عاری اور بے ایمان ہیں۔ ماضی سنہرا تھا، کیونکہ آبادی کم اور گیہوں اور چاول وافر تھا۔ لیکن کولونیل نظام اور بڑھتی ہوئی آبادی نے ملک کا کچومر نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنا دیا۔ ہر کولونیل ملک کے باشندے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہے۔"
>
> [آخرِ شب کے ہمسفر ص ۱۳۱]

۱۹۳۹ء کے بنگال کی سیاسی فضا کو ناول میں بھرپور طور پر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ کے بعد کے آنے والے اہم تاریخی موڑ سے قرۃ العین حیدر بڑی سرعت سے گزر گئیں۔ حالانکہ اگر وہ ناول میں تقسیمِ ہند کے بعد کے واقعات اور اس دور کی تہذیبی و سیاسی زندگی میں آنے والے بدلاؤ کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتیں تو "ارجمند منزل" کی تباہی و بربادی اور بالخصوص نواب قمر الزماں کی ٹریجڈی متحدہ ہندوستان کے انقلابی اور مشرقی پاکستان کے منسٹر ریحان الدین احمد کی قلبِ ماہیت [سیاسی جوڑ، توڑ] کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا تھا۔ بہر حال بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ناصرہ نجم السحر کا حیران کن باغی کردار بھی قرۃ العین حیدر کے قلم کی تخلیق ہے اور جو سماج میں موجود تمام منافقانہ رویوں کے رد عمل کے طور پر سامنے آتا ہے۔

> "پہلے یہ بھوکی پیڑھی کے ہمدرد شاعر تھے۔ اب پیٹ بھری پیڑھی کے لیڈر بننے والے ہیں۔ ناصرہ نے کہا۔۔۔ معاف کیجیے گا دیپالی دیہم لوگ ایک بہت بڑے آگ اور طوفان سے ہو کر گزرے ہیں جس کے مقابلے میں آپ لوگوں کی برطانیہ کے خلاف جدوجہد اور تقسیمِ ہند کی خونریزی ایک پکنک تھی" [ص ۳۷۱]

''ہزاروں لوگ مارے گئے۔ میں نے مرگِ انبوہ دیکھا۔ میں نے ملا کے مذہب کا رول دیکھا میں نے بنگالی پنجابی کی نفرت اور بنگالی بہاریکی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈر کا رول دیکھا۔ فرقان احمد ! جس وقت ہم یہاں مشین گنوں کا سامنا کر رہے تھے تم اپنے باپ کے پیسوں کیبدولت لندن میں مصروف عیش تھے''[ص ۳۷۲]

اس کردار سے قرۃ العین حیدر نے سماج میں موجود سیاسی مفادات رکھنے والے طبقات کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے اور اس آزردگی کا اظہار کیا جو تاریخ کے ان پنوں میں ایک طرف مشترک کلچر کے خاتم سے عبارت ہے تو دوسری طرف وہ آئینہ ہے جس کے عکس میں اس خطہ کے لوگوں کو اپنے کردار و تہذیبی بالیدگی کے متعلق ایک اور رائے قائم کرنی پڑی تقسیم کے بعد جس ناول نگار نے لکھنو سے تعلق کے باوجود پانچویں قومیت کے شہر کراچی میں قدم رکھا اور خود کو اس کی مٹی میں ضم کرنے کی کوشش کی وہ شوکت صدیقی تھے۔ انکا ناول خدا کی بستی کراچی میں ایک نئے ابھرتے ہوئے معاشرے کے اندر مادیت پرستی، دولت کی حرص و ہوس، سیاسی جوڑ توڑ مین نئی نسل کو پنپتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ لیکن ان کا تین جلدوں پر مشتمل ناول'' جانگلوس'' خاص کر پنجاب کے اس معاشرے کو پیش کرتا ہے۔ جہاں طبقاتی تقسیم ہے۔ جہاں ذات پات کا نظام بہت راسخ ہے۔ جہاں عدم مساوات ہے۔ جہاں بنیادی طور پر جنگل کا قانون رائج ہے اور اس قانون کو رائج کرنے والے خود اس معاشرے میں مہذب اور متین کہلاتے ہیں اور جو جانگلی ہیں وہ دراصل استحصال زدہ طبقہ ہے بھی اور تاریخ کی اک خاص حرکت یا جبر کے تحت پستیوں اور محرومیوں مین دھکیلے گئے لوگ ہیں۔ شوکت صدیقی نے فوکس کیا کہ یہ جانگلی کون ہیں اور سماج میں یہ جو سردار، وڈیرے، جاگیردار ہیں یہ کہاں سے آئے۔ یہ کیوں اس ملک کی جڑوں میں بیٹھے ہیں۔ یہ کیسے وجود میں آئے۔ یہ کونسے مفادت کے امین ہیں ۔یہ کیونکر نسل در نسل اپنی اجارہ داری قائم رکھ پاتے ہیں۔ ان کے سیاسی، سماجی اور شعوری ہتھکنڈوں کو شوکت صدیقی نے ناول میں بے نقاب کیا ہے۔ ناول میں شوکت صدیقی نے اینٹی ہیرو کی تکنیک استعمال کی اور اپنے صحافت کے تجربہ سے فائدہ اٹھایا۔ ایک ایسے وقت میں جب نیا ملک بن تو گیا تھا اور غیر ملکی آقا بظاہر چلے گئے تھے لیکن جاتے جاتے بھی نوآبادیاتی آقاؤں نے اپنی ذہنیت کو ملکی آقاؤں کے اندر انجیکٹ کر دیا تھا انکی سوچ پر جاگیرداری کی چھاپ تھی یہ ناول پاکستان کے دیہی سماج کے پس منظر میں ناانصافی، استحصال، غربت ظلم اور جبر جیسی منفی اقدار کو اجاگر کرتا ہے۔ شوکت صدیقی ایک ایسے معاشرے کو دیکھ رہے تھے جو نوآبادیاتی نظام کے بعد بھی اس نظام کے ثمرات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ تقسیم اور کالونیل عہد سے نجات پانے کے بعد جو تصورات تھے کہ پاکستان میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو گا لوٹ کھسوٹ نہیں ہو گی، آزادی اظہار پر پابندی نہیں ہو گی، عدم مساوات، طبقاتی اونچ نیچ سے واسطہ نہیں

ہو گا تو آزادی کے بعد کے حالات ایک اور ہی داستان سنا رہے تھے۔ نوآبادیاتی عہد سے گزرنے کے بعد بجائے ترقی کے تنزل کی طرف جا رہے تھے۔ قید و بند کی صعوبتیں، بے روزگاری، معاشی، معاشرتی، جنسی استحصال کا بازار گرم تھا۔ شوکت صدیقی کے لیے آدرشوں کا یہ بکھراؤ انکی تحریر میں حقیقت نگاری کے وصف کو لیکر آیا۔ ''نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہماری جد و جہد نوآبادیاتی حکمرانوں کے چلے جانے کے بعد جاری رہی۔ ہم نے اپنے ذہن میں پاکستان کے بارے میں جو تصورات قائم کیے تھے وہ یہ تھے کہ پاکستان میں جاگیرداری نہیں ہو گی، لوٹ کھسوٹ نہیں ہو گی، آزادیاظہار پر پابندی نہیں ہو گی۔ یہاں حالات کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تبدیلی کہیں نہیں آئی۔ قید و بند کی زندگی ویسی ہے۔ جس معاشرے کی تعمیر کے لیے جد وجہد کی گئی تھی۔ اور جس معاشرے کے لیے جیلیں کاٹی تھیں مشکلات برداشت کی تھیں ظلم و ستم سہے تھے۔ وہ معاشرتی تشکیل نہیں پا سکا۔ جس منزل کے لیے کاروان چلا تھا وہ منزل نہیں آئی''(۴)

> ''احسان شاہ نے تو جیتنا ہی جیتنا تھا۔ احسان شاہ کے پرکھے بھی تیرے پرکھوں سے جیتے تھے، جنہوں نے جنہوں نے اپنی دھرتی کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لیے جنگ لڑی تھی، بغاوت کی تھی۔ وہ باہنی وال تھے، ہار گئے تو ان سے زمین، مویشی، عزت آبرو سب کچھ چھین لیا گیا۔ انہیں تباہ و برباد کر کے جانگلی بنا دیا گیا۔ احسان علی شاہ کے پرکھوں نے انگریزوں کے کارن غداری کی، آزادی کا سودا کیا، ان کے ساتھ مل کر باہنی وال، باغیوں اور ورودھیوں کو کچل دیا۔ انگریزوں نے خوش ہو کر انہیں عزت دی، شان دی، سید اور شاہ کہا اور سید اور شاہ جی بنا بھی دیا' ایسی باتیں کیوں کرتی ہے اللہ وسایا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ 'میں نے جھوٹ تو نہیں کہا' جمیلہ اسی تلخی سے بولی' میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو پڑھا ہے وہ بتا رہی ہوں' اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ 'سر ڈنزل ایبٹ سن بہت وڈا انگریز افسر ہوتا تھا۔ انہوں نے پنجاب کی' کوموں' اور جات برادریوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے پنجاب کاسٹس۔ ایبٹ سن نے اس میں لکھا ہے، ۱۸۵۷ء کے غدر میں باہنی وال ورودھیوں نے انگریز فوجوں کو بہت تنگ کیا۔ وہ لٹیرے اور جانگلی تھے سو باہنی وال آج تک جانگلی کہلاتے ہیں۔ تو خود سوچ، انگریز کی مونچھ کا بال خاندانی جگیر دار سید احسان علی شاہ، ایک باہنی وال جانگلی اور معمولی مزارعے اللہ وسایا کو کیسے زمیں دار دیکھ سکتا ہے تب ہی تو اس نے اللہ وسایا سے زمیں داری چھین لی۔ اس کیپگ کا طرہ اور اونچا ہو گیا۔''(۵)

تو وہ گویا سماج میں وہ لوگ جو جانگلی کہلائے وہ دراصل اس دھرتی کے وہ فریڈم فائیٹر یا باغی تھے جنہیں اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی نفرت نے ایک تاریک، پسماندہ دنیا میں دھکیل دیا۔ جہاں ان پر معاشی، معاشرتی ترقی کے دروازے بند کر دئے گئے۔ انہیں صحراؤں میں دھکیل دیا گیا انہیں سولائزڈ دنیا کی طرف نہیں آنے دیا گیا۔ انہیں عبرت کی مثال بنا دیا گیا انگریزوں کی طرف سے رائے بہادروں، خان بہادروں اور سر جیسے اعزازات سے نوازے جانے والے یہ افراد تاریخ میں تضادات کے ساتھ زندہ ہیں۔ اس ملک میں تقسیم کے بعد جعلی کلیموں اور جاگیرداری، افسر شاہی نظام میں ایک عام آدمی کے ساتھ ہونے والے جبر، ظلم اور استحصال کی داستان کو تقریباً دو ہزار صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔

عبداللہ حسین کے یہاں اس سماج میں جبر اور ثقافتی گھٹن کی علامت ایک طرف مذہبی طبقہ کی اجارہ داری ہے تو دوسری طرف ریاست اور آمریت کے ہتھکنڈے ہیں جو فرد کی آزادی کو سلب کر رہے ہیں۔ رائج مذہبی پریکٹس اور کٹھ ملاّ نظریات نے انہیں مذہبی انسان نہیں بننے دیا نہ ہی مذہب کے ادارے پر وہ زیادہ اعتماد کر سکے۔

''میں نے پہلے ذکر کیا کہ میں اپنی فکر اور اپنے رد عمل کے لحاظ سے ایک نارمل شخص نہیں تھا۔ جب میں ۱۷ یا ۱۸ یا شائد ۲۰ سال کا تھا تو میں مکمل طور پر دین سے عاری ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت سے لگتا ہے کہ عرش پر تخت سجا کر بیٹھے خدا کا تصور، فرشتے، انبیا۔ یہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ بہر حال میں آن ریکارڈ مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ لیکن اس کے بارے میں کبھی لکھ سکتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے کسی بھی مذہب کے بغیر زندگی گزاری ہے۔ خالد سہیل: میں آپ سے ذاتی نقطہ نظر کے حوالے سے نہیں پوچھ رہا تھا۔ میں اس کردار کے حوالے سے آپ کے تاثرات جاننا چاہتا ہوں جو مذہب کا ادارہ سماجی کنٹرول کے حوالے سے ایک کمیونٹی اور معاشرے میں ادا کرتا ہے۔ عبداللہ حسین: یہ بہت نقصان دہ ہے یہ صرف متھ ہے کہ مذہب متحد کرتا ہے۔ آغاز میں یہ تہذیب کی قوت ضرور تھا۔ مگر اپنے اصل میں مذہب تقسیم کرنے والی قوت ہے۔ مذہب تقسیم، تقسیم در تقسیم، تقسیم در تقسیم کرتا چلا جاتا ہے کیونکہ مذہب میں حقانیت کا ایک مظہر موجود ہوتا ہے اور یہ حقانیت پھر ذاتی حقانیت میں بدل جاتی ہے اور بالآخر یہ تقسیم کرنے والی قوت بن جاتی ہے۔ اگر آپ صورتحال کا فلسفیانہ طور پر جائزہ لیں تو آپ اسی منطقی نتیجہ پر پہنچتے ہیں''(۶)

عبداللہ حسین نے اپنی نگارشات میں اپنی ہم عصر زندگی کو موضوع بنایا۔ ان کی ہر ایک سطر سے انکے تاریخی شعور کا اظہار ہوتا ہے ان کا لازوال ناول'' اداس نسلیں'' اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ایک جامع خاکہ

ہے جب دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں، اور خود برِ صغیر میں انقلابی قوتوں اور نوآبادیاتی سماج کے تحت جو زندگی کی بے وقعتی کی مثالیں انسانیت نے اپنی بوڑھی شکست خوردہ نظروں کے تحت دیکھی تھیں اس کے جواب میں ایک عام انسان نے وجودی سطح پر خود کو شناخت کرنے اور وجود کا جواز ڈھونڈنے کے لیے خود کو ہلکان کیا، کبھی فلسفہ میں اس نے بے ثباتی، بے کیفی، اداسی، اندھیرے، حیات کے مقاصد کو کھوجنے کی سعی کی تو کبھی اس کے لیے ادب، آرٹ، سائنس اور سب سے بڑھ کر مذہب سے رجوع کیا پھر علم کی ان سب شاخوں سے زندگی کو بہتر کرنے کے لیے کسی فارمولہ کسی لائحہ عمل یا کسی نظریے کی ایسی کھتونی بنانے کی سعی کی تاکہ انسان جنگوں، اقتدار اور وقت کے حرص، ہوس کے ان دائروں سے نکل سکے اس کا انسانیت پر اعتماد بحال ہو، اقدار پر یقین پھر سے پنپ سکے، رستے ہوئے ناسور پھر سے مندمل کیے جا سکنے کی امید پیدا ہو۔ تو عبداللہ حسین کے کردار بھی مذہب، فلسفہ، سائنس، تاریخ کے جواز، بقاء اور عدم بقاء اور اجتماعی و انفرادی ضمیر کی بیداری کے مباحث کو ضرور چھیڑتے ہیں کہ اس دور کے انسان کے اندر خالی ہونے کا احساس، لاحاصلی، درد، کلبیت اور بے حسی کی کیفیات نے جگہ بنالی تھی۔

> ''میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں۔ اسی طرح ایک وقت تھا جب میرا خیال تھا کہ مصیبتیں برے آدمیوں کی وجہ سے نازل ہوتیہیں اور ایک سادہ سے اصول کے مطابق گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مگر اصول؟ اصول کیا چیز ہیں؟ مجھے پتا چلا کہ وہ عقلمندی کی باتیں جو میں نے لڑکپن اور جوانی میں سیکھیں، وہ سارے زریں اقوال .... کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر ہمیں بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر خدا بیچ میں کہاں آتا ہے؟... میں پوچھتا ہوں انصاف کہاں گیا؟ انصاف، جو ہم نے صدیوں کے الٹ پھیر سے سیکھا ہے۔ جنگوں اور وبائوں اور قحطوں اور زلزوں اور دوسری آسمانی بلاؤں کے بعد سیکھا ہے۔ کیا آپ اس سے کوئی خاص اصول وضع کر سکتے ہیں؟ کوئی ضابطہ؟ کوئی ''پیٹرن'' یا گزشتہ زمانوں سے حاصلکئے ہوئے تمام انسانی علم، تمام انسانی دکھ کا کوئی 'پیٹرن؟' ہیں آج اس بات کا علم ہے کہ یہ لمبی چوڑی اور انتہائی متضاد اور منتشر آفتیں تھیں جو ہم پر اور ہمارے آباؤ اجداد پر نازل ہوئیں۔ ہم نے ان سے سوائے زریں اقوال کے کیا حاصل کیا ہے سنہری اصول... جنگوں اور قحطوں اور وبائوں میں انصاف کہاں تھا؟ ہم کیسے انسانوں کی، زندگیوں، پر حکومت کرنے کے لئے اصول وضع کر سکتے ہیں جبکہ انسانوں کے مقدر کے لئے کوئی اصول نہیں ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ چند بے روح، مردہ دل، یاسیت پرست اور بیمار پڑے لکھے لوگوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں کو فیصلہ کرنے بیٹھ جائے جبتک وہ خود اپنے مستقبل اور اپنے انجام کے متعلق بے

خبر اور بے بس ہیں اور ان قوتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے جن کے ہاتھمیں ان کے خاتمہ ہے۔ تم نے ان لوگوں کی بے بسی دیکھی ہے جب وہ جنگ یا قحط کے دوران اپنے قانون چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک شخص کو بھی مرنے سے ختم ہونے سے نہیں بچا سکتے مگر اپنی بد نما شان و شوکت کے ساتھ، چہروں پر مصنوعی سکون طاری کئے، کاغذوں اور دفتروں کی میزوں کے ساتھ اپنا پیشہ جاری رکھتے ہیں جب وہ معصوم انسانوں کو موت سے نہیں بچا سکتے تو اپنے قلم کاغذ اور دفتر کے فرنیچر کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگتے ہیں تم سمجھتے ہو کہ وہ نالائقہیں؟ نہیں۔ اس سارے وقت میں انہیں مستقل اپنے کام کی بے اثر اور نفرت انگیز نوعیت کا علم رہتا۔ وہ نالائق نہیں ہیں، نااہل ہیں۔ صاف صاف نااہل۔"(۷)

"جانتے ہو ہم نے خدا کو کیوں ایجاد کیا ہے؟ اپنے آرام کی خاطر۔ کیونکہ ہم سوچنا نہیں چاہتے، اور سچائی کی تلاشمیں سوچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے،... دنیا کے تمام مذاہب محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ ہنہہ! پر ہوتا کیا ہے۔ جونہی آپ ایک مذہب کو اپنا لیتے ہیں آپ کے دل میں نفرت کا تعصب کا بیج بویا جاتا ہے۔ دوسرے مذہب کے خلاف، دوسرے تمام مذاہب کے خلاف، ان تمام ان گنت فرقوں کے خلاف جن میں آپ شامل نہیں ہیں۔ محبت کے تمامپرچار کے باوجود اس وقت خود بخود ہماری عقل سلب ہو جاتی ہے اور ہم دنیا کے سب سے مطمئن انسان بن جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے زندگی کا سب سے تسکین بخش جذبہ کون سا ہے؟... ذہن انسانی کے سب سے بڑے کرب آلود سوال کا جوابہم اپنے بڑے بوڑھوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں؟ ہاں، محضاس لیے! محض، اس لئے!! ہم بڑے بوڑھوں کو اپنار ہنما بنا لیتے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، محض اس لئے کہوہ بڑے بوڑھے ہیں یا اس لئے کہ وہ ہمیں عقل کے استعمال سے نجات دلاتے ہیں۔۔"(۸)

مصنف کے دعویٰ کے برعکس ناول میں کسی ایک کردار کی رومانویت کی بجائے کئی ٹکڑے جوڑے گئے ہیں جن کا تعلق اس وقت کے تمام نظام ہائے حیات سے تھا۔ یعنی ناول ہیں کئی ٹریک ہیں جس سے عبداللہ حسین کے سیاسی، تاریخی اور سماجی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ دراصل یہ ناول صحیح معنوں میں ایک عہد کی تاریخی، معاشرتی، معاشی، سماجی اور سیاسی تشکیلات اور بیک وقت بکھراؤ کا امین ہے ناول کے اندر تاریخی وہ تہذیبی عنصر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں' کا موضوع ایک فرد نہیں بلکہ ہم عصر زندگی کے مختلف ادوار اور ان میں سے گزرتے ہوئے عمل اور صعوبت کے گرداب میں محصور، کم از کم تین نسلوں کے نمائندے ہیں ناول کا تانا بانا انہی کے تجربات کے گرد بنایا گیا ہے۔ یہ عمل جس زمانے یا دوران کو محیط ہے، وہ پہلی جنگِ عظیم سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے اور تقسیم ہند کی پر آشوب اور ہنگامہ خیز مدت تک پھیلا ہوا ہے ایک معنی میں یہ ہندوستان میں بسنے والی کئی نسلوں یا تاریخ کے بدلتے ہوئے ادوار کا مرقع ہے اور اس میں اس ذہن کی عکاسی ملتی ہے جو معاشرت، تہذیب اور سیاست کے پسِ منظر میں اپنے ردِ عملکو آشکار بھی کرتا ہے اور ان سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے'' (۹)

''ایک کسان کھلیان میں سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سارے کسان نکل کر دروازے پر جمع ہو گئے۔ نعیمکھلیان میں اکیلا رہ گیا'' یہاں کیا کر رہے ہو۔ کام چور۔ ''ایک گھڑ سوار نے چلا کر پوچھا۔ وہ سب خاموش کھڑے ابلتے ہوئے غصے سے انہیں دیکھتے رہے ''تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ یا تمہارا کوئی عزیز مر گیا ہے۔ ''گھڑ سوار دوبار،چلایا پھر کوئی جواب نہ پا کر وہ کود کر گھوڑے سے اترا اور چابک ہوا میں لہرا کر چلایا۔'' فصلکا حساب دو۔'''' ہمارے پا سکچھنہیں ہے۔ ''پہلے کسان نے کہا ۔'' کیوں نہیں ہے؟'' غصے سے اندھا ہو کر وہ دوبارہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چابکو پوری طاقت سے ہوا میں پٹخانے لگا۔ گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر اٹھ کھڑا ہوا۔ انتہائی نفرت اور غصے کے زیر اثر کسان ایکلمحے کے لئے گنگ رہ گیا اور تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح سانس لینے لگا۔ پھر اس کے گلے سے تیز پھٹی ہوئی آواز نکلی'': کیوں نہیں ہے؟ ہیں؟ یہ دیکھو....''اس نے پاس بندھے ہوئے بیل کے پہلو میں چاروں انگلیاں اتار دیں جو اسکی ننگی پسلیوں میں غائب ہو گئیں۔ بیل دہشت زدہ آواز میں ڈکرایا۔ ''اور یہ...''اس نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھایا۔ اور یہ ایک خوفناک نظارہ تھا، جس کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے فاقہ زدہ انسانی جسم دیکھے ہیں۔ اپنی پسلیوں میں اس کی انگلیاں ایک ایک پور تک اتر گئیں۔'' سئور۔ '' وہ اسی پھٹی ہوئی آواز میں چیخا۔ '' بھاگ جاؤ۔ جاؤ.... ہم آگ لگا دیں گے۔ کھلیانوں کو..... گھروں کو.... سب کو۔ ''کسانوں میں جانوروں کے گلے کی سی بلبلاہٹ بلند ہوئی اور وہ خالی اوپر اٹھا کر بڑھے۔ ''(۱۰)

کیونکہ اس استحصالی نظام نے انہیں پسماندہ اور معاشی طور پر کمزور بنا دیا تھا بھوک کا عفریت انہیں، انکی نسلوں انکے مویشیوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا یہ نوآبادیاتی سماج برِ صغیر کے باشندوں کی زندگی پر اس طور پر حاوی رہا کہ آج تک اس ذہنیت اور نظام سے چھٹکارہ حاصل کرنا ان کے بس میں نہیں۔

''نوآبادیاتی سماج ہندوستان کے باشندوں کے لیے کس قدر سفاک تھا اس کی ایک اور مثال دیکھیے جب رانی کوٹ کے سٹیشن پر دو گورے سارجنٹوں نے آکر اسے ہینڈل سے علیحدہ کیا تو وہ گندم کی بوری کی طرح زمین پر گرا اور مر گیا۔ سارجنٹوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گورے کا چہر کھڑکی سے باہر آیا۔ پولیس والوں کے جواب میں اس نے کچھ کہا جس پر دونوں سارجنٹوں نے مستعد یسے فوجی سلام کیا اور بولے: ''لیکن آپ زیر حراست ہیں'''' باہ......'' گورے نے گال پھلا کر کہا اور کھڑ کی گرادی۔ سارجنٹ دونوں ہینڈل پکڑ کر پائیدان پر کھڑے ہوگئے۔ ''وہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پر بوڑھا مر گیا۔'' مجمعے میں سے کسی نے بات کی۔ ''تو کیا ہوا؟'' سنہری چشمے اور بڑے سے ماتھے والے ایک آدمی نے کہا۔ ''وہ عدالت میں تو پیش ہوگا۔'' نعیم نے خفگی سے کہا۔ ''ضرور ہوگا۔ ضرور ہوگا۔'' وہی آدمی بولا۔ ''یہ لوگبڑے قانون دان ہوتے ہیں۔ لیکن جیوری میں کون ہوگا..... تمہاری کوئی چچا جیوری میں ہے؟'' وہ جانے کے لئے مڑا' پھر پلٹ کر نعیم کے پاس آکھڑا ہوا۔ ''یہ سوَر' میں تمہیں بتاتا ہوں برخوردار' آج ہی رات کو اپنی بیوی کے ساتھ جا کر سوئے گا۔ میں نے اپنی عمر میں ایسے پچاس سے اوپر واقعات دیکھے ہیں۔ ایسے مقدموں کے لئے سفید جیوری ہوتی ہے۔ بالکل سفید۔'' نعیم اس کے لہجے کی تیزی سے گھبرا گیا۔ جب وہ پلٹ کر فارم کے باہر جا رہا تھا تو اس نے مڑ کر دیکھا ایک بھدی سی بوڑھی عورت لاش کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھی۔''(۱۱)

ان کا ناول '' باگھ '' ایک ایسے نوجوان کا قصہ ہے جو بیٹھے بٹھائے ریاست کے شکنجے میں یوں پھنس جاتا کہ خوف، جبر اور گمشدگی اس کا مقدر بن جاتی ہے باگھ علامت ہے سماج اور معاشرے میں ایسے نادیدہ خوف کی جس نے افرادِ معاشرہ کو اپنی جکڑ میں یوں لے رکھا ہے کہ مزاحمت سے زیادہ اس کی موجودگی اور غیر موجودگی کا احساس انہیں مضطرب کیے دے رہا ہے ایسا نادیدہ خوف جو ریاستی جبر کی علامت ہے۔ جہاں وجودی سطح پر انسان خوف، بے بسی، دہشت اندھیرے اور مایوسی کی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے جہاں اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے عبداللہ حسین کے ناول '' باگھ '' اور '' نادار لوگ '' ریاستی جبر اور سیاسی ہتھکنڈوں کی استحصال پر مبنی ایک ایسی دستاویز ہیں جس کے

حوالے سے خود عبداللہ حسین کو بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ڈاکٹر مجاہد مرزا نے عبداللہ حسین کو بجا طور پر ریاستی جبر کا نوحہ خواں کہا ہے:

''ریاست بنیادی طور پر جبر کا آلہ ہے۔ریاست کے جبر میں کمی تبھی ہوتی ہے جب لوگ نہ صرف سیاسی طور پر انتہائی باشعور ہو جائیں بلکہ منظم بھی تاکہ ریاست کو انکی طاقت کا احساس ہو جائے۔جبر وہ تب بھی کرتی ہے مگر بہت محتاط ہو کر۔ریاست اور جبر کا تعلق دیکھنے کے لیے آپکو بغداد کے زندان ابو غریب اور گوانتاناموبے کے قید خانے کو سامنے رکھنا ہو گا کہ وہ ہی ریاست جو اپنی سرزمین پر اپنے لوگوں کے شعور اور نظم کے ڈر سے جبر کو محدود کرنے پر مجبور ہوتی ہے وہ دوسری سرزمینوں پر جبر و تشدد کے کون کون سے انداز اپناتی۔عبداللہ حسین ان پہلے چند ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے اردو ادب پڑھنے والوں کو ریاست کی بربریت،ریاست کی مستور قہاریت اور ریاست کے مذموم ہتھکنڈوں کے بارے میں آگاہ ہی نہیں بلکہ ان سے بچنے اور ان کے کلاف صف آرا ہونے کا درس بھی دیا تھا'' (۱۲)

ناول میں عبداللہ حسین نے کشمیر کی جدوجہد آزادی اور ۶۵ کی جنگ بارے حکومتی مئوقف سے انحراف کیا ہے 'ناول میں عبداللہ حسین نے تھانہ کلچر کی سفاکی کو بھی بیان کیا ہے مقتدر قوتوں اور معاشرے میں فرد کی آزادی کو باہم متصادم دکھایا ہے۔ فرد اور معاشرے کے تال میل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔نئے معاشرے کے اندر تضادات کو بھی پیش کیا ہے۔جنگ زدہ معاشرے کے اندر افراد کس طور پر تہذیبی، روایتی اخلاقیات سے عاری ہو کر بقا کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔قومی بیانیہ کیونکر زندگی کے تلخ حقائق سے متصادم ہوتا ہے۔ نظریاتی ریاستیں ، حکومتی مشینری کس طرح واقعیت میں افراد یا قوم کے ساتھ سلوک رکھتی ہے اس سب کا مئوثر بیان اس ناول میں موجود ہے۔ باگھ کے موضوع کے حوالے سے عبداللہ حسین کہتے ہیں:

''اس میں تین چار موضوعات ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس میں ایک موضوع انصاف کا ہے، معاشرتی انصاف بلکہ اسمیں ایک جملہ ہے جہاں ایک آدمی جیل میں ہے اور غالباً سی آئی ڈی کا ایک آدمی اس کو قائل کرنے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے اگر تم ایسے کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے ۔وہ ہر طرح سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ آدمی نہیں مانتا پھر اسے آخر میں خیال آتا ہے کہ اس طرف سے آؤ شاید یہ حربہ کارگر ثابت ہو اور وہ کہتا ہے ''اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارا خدا اور رسول ہے'' یہ آدمی(جو جیل میں ہے) کہتا ہے ''اس سے خدا اور رسول کا کیا تعلق ہے ؟ میں تو انصاف مانگتا

ہوں" یہ ایک بڑا لطیف جملہ ہے اور اس میں سارے حصے کی بنیاد ہے کیونکہ ہمیں تو بتایا گیا کہ جو تم پر ظلم کرتے ہیں جبر کرتے ہیں انہیں معاف کر دو۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو ورنہ فیصلہ خدا پر چھوڑ دو وہ اجر دے گا، انصاف کرے گا، عدل کرے گا وغیرہ وغیرہ"(۱۳)

نصاف کا تقاضا اس معاشرے میں کمزور کا حق نہیں ہے۔ بلکہ معاشرتی، مذہبی یہاں تک کہ قانونی، ہر سطح پر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ انصاف ایک ایسا مہنگا سودا ہے جہاں صحیح غلط کی بحث میں پڑنے سے بہتر ہے اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا جائے انسان تن بہ تقدیر رہے۔' باگھ "ریاست کے اندر فرد کی اس بے بسی کا آئینہ دار ہے جب فرد اپنے عمل میں آزاد نہیں۔ بلکہ وہ مقتدر قوتوں کے سامنے بے بس بھی ہے جبر کا شکار بھی ہے اور انصاف وآزادی جیسے بنیادی حقوق سے محرومی کا بھی شکار ہے۔" پہلی بار اسد کو اس بات کا احساس کا ہوا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے وہ حالات کی یلغار کے آگے اِدھر سے اُدھر لا مدد بھاگتا رہا ہے، کہ اپنے ارادے سے اپنے عمد سے اس نے آج تک کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ حالات کے اس دھارے کو روکنے کی، اسکا رخ موڑنے کی سعی نہیں کی کہ جس وقت، جس طور اور جس طرف بھی اسکی زندگی کے حالات نے رخ کیا ہے اس نے اسی رخ پہ اپنا منہ موڑ لیا ہے اور بے اختیار و جنبش اسی طرف کو چل دیا ہے اس نے زندگی سے اسد نے سوچا کبھی مہلت حاصل نہیں کی، ہمیشہ وصول کی ہے۔ ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری، مہلت، مہلت، مہلت۔ اس نے محسوس کیا کہ عمر بھر سے اس کے دل کے اوپر بے عملی کے اس بار کا مینار چنا جاتا رہا ہے۔" (۱۴)

مستنصر کا ناولخس و خاشاک زمانے ۱۹۲۹ء سے ۲۰۰۱ء کے عرصہ پر محیط ہے۔ بالخصوص پاکستان کے قیام کے بعد مابعد نوآبادیاتی چیلنجز جن میں مادیت پرستی، کرپشن، فوجی آمریت، سیاسی عدم استحکام اور شخصی انداز حکمرانی، غریبوں کا استحصال اور غریب اور امیر کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی دنیا، تاریخ اور تاریخی قوتوں کی تعبیرِ نو، اور جدید دنیا سے جنم لیتے کثیر الثقافتی کلچر کی ناگزیریت جیسے موضوعات کو پیش کرنے والوں کی صف میں تارڑ سب سے پیش پیش ہیں۔ سامراجی نظام کے خاتمے کے بعد پہلے دو اور پھر تین مملکتوں کا وجود میں آنا تاریخ کا ایک بڑا واقعہ تو ہے لیکن پاکستان کی حد تک یہ اس طرح سے شاندار تجربہ ثابت نہ ہو سکا کہ اس دیس کے باسیوں کو بدیسیوں کے جانے بعد جن کے اندر انکی اپنی ذات اور نظام کے لیے موجود اصول پسندی کا براہ راست نہ سہی لیکن فائدہ یہاں کے باشندوں کو ہو رہا تھا خواہ آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی۔ آزادی کے بعد جو دیسی نظام آیا اس میں آمریت، جاگیر داری نظام، مفاد پرستانہ اقدامات کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جس نے معاشرے کے اندر گھٹن کو جنم دیا۔ مستنصر کا تاریخی و مذہبی شعور اسے باور کراتا ہے کہ ریاستیں نہ تو فردِ واحد سے چل سکتی ہیں اور نہ ہی کسی عقیدے یا

نظریے کی مدد سے۔ایک خالص مذہبی ریاست سیاسیات کے سائنسی اصولوں کے بغیر نہیں چلائی جاسکتی۔کیونکہ ہر نظریاتی ریاست کہیں نہ کہیں ایک غیر لچکدار رویے کو جنم دیتی ہے۔

''چاہتا ہوں پر ایسا نہیں چاہتا جیسا وجود میں آنے کو ہے۔۔ہم انگریز اور ہندو کی غلامی سے نکل کر ایک بڑی غلامی میں چلے جائیں گے۔۔۔ ہمارے پیچھے تھوتھنیوں سے جھاگ نکالتے، غرّاتے ہماری پنڈلیوں کا ہی نہیں ہمارے بدنوں کا ماس بھی نوچ ڈالنے والے کتّے وہیں رہیں گے۔۔۔ایک الگ ملکحاصل کرنا بیکار ہے جب تک کہ تم پہلے اُن تمام باولے کتّوں سے نجات نہیں حاصل کرلو۔۔۔اُن سب کو کُچلا کھلا کر اُنہیں ہلاک نہ کردو۔۔۔اور اُن کے ساتھ اُس مذہبی تعصّب کو دفن نہ کردو جو بالآخر تمہیں پتھر کے زمانے میں لے جائے گا۔''(۱۵)

''ہمارے آس پاس جتنے بھی گلی کُوچے اور محلے ہیں وہاں بے گھر ہو جانے کے خوف کا اضطراب راج کر رہا ہے۔۔۔ کسی کو بھی نہ اپنے آپ پر اور نہ ہی تاریخاور زمانے پر کچھ اختیار رہا ہے۔۔۔''میں اپنے آپ کو ہلاک کر دینا چاہتا ہوں۔۔۔پر میر انشانہ اچھا نہیں۔۔۔ میں اپنے زمانے اور تاریخ کو مار ڈالنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں اُن کی بے بسی اور خوف سے ہمدردی رکھتا ہوں جو ہمارے کوٹھے پر جلتی آگ کو اپنے لیے ایک چتا تصور کرتے ہوئے گولی چلا دیتے تھے۔۔۔اب دفع بھی ہو۔۔۔تھری ناٹ تھری کو اپنے کندھے سے لگائے اُس کی نالی ہندو اور سکھ محلوں پر مرکوز کیے وہ اپنے نشانے کا تعین نہ کر پا رہا تھا کہ وہ آدمی تو ایک نابینا تھا۔۔۔اُسکے اندر ایک انسان تو کیا ایک مکوڑے کو ہلاک کر دینے کی بھی خواہش نہ تھی۔۔۔ اُس نے آج تک کسی سانپ کو بھی گزند نہ پہنچائی تھی۔۔۔اُسے اِسصورتِ حال میں دھکیل دیا گیا تھا۔۔۔ مجبور کر دیا گیا تھا۔۔۔وہ اس اجتماعی پاگل پن میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔۔۔اپنے آپ کو الگ رکھنے کا خواہشمند تھا اور پھر بھی اُس کے ہاتھ میں ایک پُرانی تھری ناٹ تھری کی بندوق آگئی تھی۔۔۔ہر انسان کے پیدا ہوتے ہی عقیدے کا ایک طوق اُس کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ عمر بھر اُس طوق میں جکڑا رہتا ہے اور اُس پر فخر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ تو سچائی کی راہ پر ہے آزاد ہے جب کہ دوسرے جھوٹ کے طوق میں جکڑے ہوئے ہیں۔۔۔امیر بخش نے تو یہ طوق اُس لمحے اُتار پھینکا تھا جب خوشی محمد تھانیدار کے کتّوں نے اُس کی پنڈلی میں اپنے دانت گاڑ دیئے تھے۔۔۔پر اُس کے مقابل وہ لوگ تھے جو اس طوق کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔''(۱۶)

"اُس روز انجن ماسٹر ایاز صادق بھٹی تھا۔۔۔ ہے تو وہ عیسائی پر اُس کی راجپوتی آنکھ نہیں جاتی، دوسرے عیسائیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا اُنہیں بلڈی چُوڑے کہہ کر پُکارتا ہے۔" (۱۷)

''وہ ملک جو صرف مذہب کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔۔۔ تادیر ثقافت اور زبان کی یلغار کو سہہ نہیں سکتے۔۔۔ منتشر ہو جاتے ہیں''(خس و خاشاک زمانے،) مستنصر کے یہاں سیاسی شخصیات کے خاکوں کی پیشکش میں عینیت پر مبنی کا تصورات کی پیشکش نہیں ملتی۔اس کی اشتراکی فلسفہ کمٹمنٹ اور ایک زمانے میں بھٹو سے وابستگی کے باوجود وہ نظر انداز نہیں کر پاتا کہ خود بھٹو بھی اختیارات کے استعمال میں شخصی آمریت کا شکار رہا۔دوسری جانب جنرل ضیا کے دور کی پالیسز خاص کر بھٹو کی پھانسی اور مذہبی حوالے سے انتہا پسندانہ پالسیز اور افغان روس جنگ مین امریکیوں کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہونے ،اور مدرسوں میں مجاہدین اور اسلام کے سپہ سالاروں کی تربیت، ناپختہ اذہان کی وہ کھیپ جو سوویت روس کے بعد آج خود اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں اس سب کے نتیجہ میں ملک میں پیدا ہونے والی شدت اور انتہا پسندی نے اس قوم کو جس راستے کا مسافر بنا دیا ہے وہاں تباہی اور بربادی کی ایک تاریخ ہی رقم ہو سکتی تھی تھی جو کہ ہو کر رہی۔ مستنصر کی نظر آمریت کے ظاہری پردے کے اندر تضادات کا کھوج بھی لگاتی ہے اور بہت چھوٹی سی جزئیات اسے آمریت کے کھوکھلے پن کی جھلک دکھلانیکو کافی ثابت ہو سکتی ہیں اپنے اس ناول میں غالبا کھیتوں ہیں ملمراتے سانپوں کی فصل اور محمد جہان کے کنویں سے نکلنے والے بونے انہی عناصر کی علامتیں ہو سکتی ہیں جنہوں نے بالآخر اس ملک پر راج کرنا تھا۔ جہاں آزادیِ اظہار مفقود تھا۔اس کی جھلکیاں اس ناول میں دیکھیے:

''ہزاروں بے انت بے حساب سانپ زمین سے پُھوٹتے مست ہوتے جُھومتے تھے۔۔۔ ایک عام فصل میں اتنے بُوٹے نہیں اُگتے جتنے سانپ وہاں اُگے ہوئے لہراتے تھے''(۱۸)

"چوہدری ہم نے کہیں دفع دور نہیں ہونا۔۔ ہم راج کرنے کے لیے آئے ہیں۔" اُن میں وہ بونا جو بہت ہی بونا تھا، بولا'' جب تاریخ کٹ پھٹ جائے گی، جغرافیے ادھڑ جائیں گے تب۔۔۔ خلق خدا نہیں ہم۔۔۔ ہم بونے راج کریں گے۔۔۔بونے بکواس نہیں کرتے بخت جہان۔۔۔ ہم وزیر کبیر اور بادشاہ ہوں گے۔۔۔ جرنیل کرنیل ہوں گے۔۔۔ جنت کے شیدائی حُوروں کے تمنائی ہوں گے۔۔۔ ایک مملکت خداداد میں خلق کو عقیدے کی کند چھری سے ہولے ہولے ذبح کریں گے۔۔۔ ہم محمد جہان کے کنویں میں سے یونہی نکل کر نہیں آ گئے۔۔۔وہ دن آ رہے ہیں جب ہم راج کریں گے۔۔۔ گورا بینڈ بجا کر چلا جائے گا اور ہم راج سنگھاسن پر براجمان ہو جائیں گے۔۔۔۔ پتہ ہے کب؟''(۱۹)

یہ مجاہدین تھے جنہوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔۔۔ ہر گھر کی دولت ہی کو نہیں عزت کو بھی لوٹا۔۔۔ میں تمہیں کیا بتائوں کہ ہزاروں لڑکیاں حاملہ ہو گئیں اور اُن کے پیٹ میں جو بچے تھے وہ اُن متشرع مجاہدین کے تھے جو نہ صرف اُن کے ہم نسل تھے بلکہ ہم عقیدہ تھے۔" (۲۰)

حسن منظر کا تہذیبی و تاریخی شعور سندھ کی دیہی فضا میں زمیندار، ہاری ظالم اور مظلوم، غالب اور مغلوب کے رشتے کی تفہیم کرتا دکھائی دیتا ہے ایک طرف اس فضا میں طبقاتی تقسیم اور تفاوت ہے کہ زمینداروں اور رئیسوں کے شوق، شغل انکے گھروں کی اندرونی فضا ایک طبقاتی سطح ہے کیونکہ تقسیم کے بعد بھی سندھ کے زرعی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو دوسری طرف خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے ہاریوں کا مظلوم طبقہ ہے چونکہ ان کے پاس نہ حقِ ملکیت ہے اور نہ پیٹ بھر کھانے کو لہذا اپنے حالات سے لاتعلقی، قناعت، سستی و کاہلی اور بے حسی سے زندگی گزارے چلے جا رہے ہیں اس گاؤں میں کوئی بھی فرد بالخصوص نچلے طبقہ کا کوئی بھی فرد کسی بھی طرح کے انقلاب اور رومان انگیزی سے محروم ہے۔اس کمی کا ازالہ مصنف کے نزدیک اسی اعلیٰ طبقہ میں سے ہی ایک فرد 'احمد بخش' کے کردار کی تشکیل کی صورت میں ہوتا ہے جو اس سماج کی کجیوں اور کمزوریوں کو اپنے سماجی، تہذیبی اور تاریخی شعور کی بصیرت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔جو اپنے یہاں کی فرسودگی کے ساتھ امریکہ جیسے مادی ترقی کی دوڑ میں فزوں تر ملک میں زندگی گزارنے کا تجربہ رکھتا ہے وہاں کے معاشرے میں انسانی اقدار، اور بشریاتی سطح پر ویلیوز کی بالادستی کا مشاہدہ کار بھی ہے اور کمزوریوں کا شاہد بھی، ساتھ ہی ساتھ اس کا اجتماعی شعور اسے جذباتی ایڈونچر کی بجائے اکیسویں صدی کے فرد کے طرزِ احساس کے عین مطابق فرد کے مسائل، امن کے بقاء کے ایسے راستوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔کہ جہاں یہ باشعور فرد اپنے 'یہاں' کی اہم اقدار کے باوجود رومانوی جوکھم اُٹھانے کا قائل نہیں ہے۔نہ ہی سماج سدھار سیوک کے روپ میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس مرد اساس سماج میں مرد کی خوشنودی کے حصول سے بڑھکر اور کوئی بھی فریضہ اہم نہیں ہے۔اپنا مقام بنانے اور اس مقام کو برقرار رکھنے کے لیے ہر سطح پہ جانا اس کے دین و مذہب کا حصہ ہے۔یہاں سے ہی اس سماج میں جاگیرداری نظام کے استحصال اور سفاکیت کا در کھلتا ہے کہ جس نے اپنے ہی گھر میں بے حیائی، جنسی، گھٹن اور خود غرضی کو فروغ دیا ہے۔ایک طرف مریم ہے جو صغیر سنی میں بھی اپنے مقدرات اور حیثیت کا ادراک رکھتی ہے اپنے سے چوگنی عمر کے مرد کے جنسی استحصال، مریضانہ، خواہش پرستی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے بغیر کسی احتجاج یا مزاحمت کے جذبہ کے، دوسری طرف جاگیر ادارنہ ذہنا ور مخصوص مذہبی تعبیرات نے عورت کی غیر فعالیت اور ایک مائینڈ

سیٹ فروغ میں جو اہم کردار کیا ہے اس نے مریم اور حرمت جیسے کمزور ذہنوں کو پیدا کیا ہے جن کی زندگیاں مرد کی تسکین، اور نفسانی خواہشات کی تکمیل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ چند ٹکوں کے عوض اپنی زندگی پر اپنا اختیار کھو بیٹھتی ہیں۔

> ''یہی کہ ایک مرد نے اپنی عورت کو بلوایا، وہ اسکو پہنچادی، اور اس نے حقِ شرع ادا کیا' نہیں ایک کمسن بچی کو' حرمت بھنائی ہوئی اُٹھ کر مریم کے پاس گئی۔ اس کے دوپٹے کو الٹا اور اس کے ایک کھٹی نارنجی جتنے سینے کو اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں اور انگوتھے کے درمیان دبا کر اُٹھاتے ہوئے بولی، 'کمسن بچی ہے ؟' مریم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی سوکن، ساس، یا نائیکا کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک کیا ہونے لگا۔ اس کا جسم اس کا اپنا ہے بھی نہیں۔ جس کے ساتھ جس کا جو جی چاہے کرے''(۲۱)

اس سماجی ڈھانچہ میں ایسی بچیاں جو کسی معذوری کا شکار ہو بیٹھیں ان کی موت اس فضا میں جذبہ اطمینان کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ عورت کی اس سماج میں حیثیت بھیڑ بکری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو غیرت کے نام پر بڑی آسانی سے قتل کر دی جاتی ہے اور کاری کا نام اس کی شناخت ایسے بنتا ہے کہ سماج میں روایتی طور پر دفناتے وقت بھی کسی احترام کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔

> ''انکے ہاں کا امام اسکی نمازِ جنازہ پڑھانے کو تیار نہیں ہوا تو عورت والے بابا کے پاس آکر منتیں کرنے لگے، 'تم پڑھادو' بابا نے آخر کو حامی بھر لی اور کہا، 'نعش کو نہلا کر لانا'۔ ان کے جانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا 'تو پڑھا دیجیو' مجھے لگا اس کام سے وہ بھی بچ رہا ہے، وہ لوگ میت کو عشا کی نماز کے بعد اندھیرے میں لیکر آئے۔''(۲۲)

حواشی و حوالہ جات

(۱) ڈی ایچ لارنس، اخلاق اور ناول، مشمولا فکشن فن اور فلسفہ، مترجم مظفر علی سید، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۶ء

(۲) ڈاکٹر سید عامر سہیل و شوکت نعیم قادری، (مرتبین)؛ قرۃ العین حیدر خصوصی مطالعہ، لاہور: پاکستان رائیٹرز کوآپریٹو سوسائیٹی، طبع دوم، ۲۰۱۵ء ص ۱۲۴

(۳) قرۃ العین حیدر، آخرِ شب کے ہمسفر، لاہور: چودھری اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۰

(۴) شوکت صدیقی، افکار و شخصیت، مرتبہ نثار حسین، کراچی: رکتاب پبلی کیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۰۶

(۵) شوکت صدیقی، جانگلوس، کراچی: رکتاب پبلی کیشنز جلد دوم،، ۲۰۱۳ء ص ۶۶

(۶) خالد سہیل و عمر میمن، عبداللہ حسین سے ایک انٹرویو مشمولہ عبداللہ حسین۔ایک مطالعہ، مرتب سید عامر سہیل، ملتان: بیکن بکس ۲۰۱۶ء، ص ۶۱

(۷) عبداللہ حسین، اداس نسلیں مشمولہ مجموعہ عبداللہ حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۴۱۶/۴۱۷

(۸) ایضاً، ص ۴۱۹/۴۲۰

(۹) اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول، علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ۱۹۱

(۱۰) ایضاً ۲۳۷/۲۳۸

(۱۱) ایضاً ص ۴۱/۴۲

(۱۲) مجاہد مرزا ڈاکٹر، ریاستی جبر کا نوحہ خواں مشمولہ، عبداللہ حسین تخلیقی سفر کی نصف صدی، ایضاً، ص ۶۱

(۱۳) فخر زمان، لندن میں عبداللہ حسین سے چند باتیں، مشمولہ عبداللہ حسین، فن و شخصیت، مرتب، محمد عاصم بٹ، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۸۳

(۱۴) باگھ، مجموعہ عبداللہ حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۶۸۵

(۱۵) تارڑ، مستنصر حسین، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء ص نمبر'' ۲۶۸

(۱۶) ایضاً ۲۸۱۔۲۸۰

(۱۷) ایضاً، ص نمبر ۲۸۹

(۱۸) ایضاً، ص نمبر ۱۲۱

(۱۹) ایضاً، ص نمبر ۱۵۲

(۲۰) ایضاً، ص نمبر ۴۴۸

(۲۱) حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، کراچی: شہر زاد پبلشرز، ۲۰۰۸ء ص ۱۹

(۲۲) ایضاً ص ۸۱